اٹھارویں صدی عیسوی کی اُردو شاعری میں سماجی وتہذیبی زوال کا منظر اور تصوف کا میلان

ڈاکٹر نجیب جمال*

ذیشان تبسم**

Abstract:

The decline of Mughal Empire in 18th Century badly affected all spheres of life. Social and administrative set up turned into anarchy which ultimately distorted the contours of civilization. Economic and moral values were also lost. In such chaotic situation, it was only Urdu poetry which flourished. However, the prevailing circumstances affected Urdu poetry and resultantly the element of dejection, despondency, hopelessness and pessimism that brought Urdu poetry closer to mysticism.

This research paper focuses on the goldan age of Urdu poetry with special reference to economic, social and cultural values and norms: and without its cognizance the proper comprehension and appreciation of Urdu Poetry is useless.

مشہور جرمن مفکرِ تاریخ آسوالڈ اسپنگلر (Osweld Spanglar/ ۱۸۸۰ء۔۱۹۳۶ء) کا خیال ہے کہ تہذیب تاریخوں کے سلسلے کا نام ہے۔ ہر تہذیب ایک جسم نامی کی طرح پیدا ہوتی ہے، پروان چڑھتی ہے، پھر بوسیدہ ہو کر مر جاتی ہے۔[۱] اسپنگلر کے اس تاریخی جبریت کے تصوّر کے آخری حصے کو ٹائن بی، ہنٹنگٹن، فوکو یاما اور

* پروفیسر شعبۂ اُردو واقبالیات / ڈین فیکلٹی آف آرٹس، اسلامیہ یونی ورسٹی، بہاول پور

** اُستاد شعبہ اُردو واقبالیات، اسلامیہ یونی ورسٹی، بہاول پور

اقبال نے رَد کیا ہے، تاہم اٹھارویں صدی کے مغلیہ ہندوستان پر یہ اصول لاگو ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ تقریباً دو صدیوں کے عہدِ عروج کے بعد اٹھارویں صدی عیسوی میں مغلیہ سلطنت بھی ان مراحل سے گزرتے ہوئے زوال پذیر ہوگئی۔ سیاسی زوال کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ امنِ عالم تباہ، نظم ونسق تہ وبالا اور تہذیبی خدوخال بری طرح مسخ ہوکر رہ گئے۔ معاشی نظام اور اخلاقی صورتِ حال دگرگوں ہوگئی۔ لاقانونیت کو ہوا ملی اور چور بازاری عام ہوگئی۔ مفسدوں اور فتنہ پروروں کی بن آئی اور اشرافیہ کی پگڑیاں سرِ بازار اُچھلنے لگیں۔ خیر وشر میں امتیاز اُٹھ گیا اور حرص وآز کی وجہ سے شریفانہ اخلاق و خصائل معدوم ہوگئے۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے بجا طور پر اِس انحطاط پذیری کو ایک بیمار کے بھیانک اور ڈراؤنے خوابِ پریشاں سے تعبیر کیا ہے۔(۲) ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے مطابق:

> ''یہ صرف ایک سلطنت کا زوال ہی نہیں بلکہ ایک ملت اپنے بلند اخلاقی مقام سے پستی کے گڑھے میں گرگئی تھی۔''(۳)

اس ساری صورتِ حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں کے پاس تخیل اور عمل کی سطح پر گریز اور فرار کے سوا کوئی راستہ نہیں بچا(۴) اور اس فراری ذہنیت نے عیش کوشی، نشاط پرستی اور بزم آرائی جیسی پناہ گاہیں تلاش کرلیں۔ محمد شاہی اور احمد شاہی دورِ حکومت میں خاص طور پر تعیش پسندی نقطۂ عروج کو پہنچ گئی۔ شراب نوشی عام ہوگئی، نازک بدن رقاصاؤں اور سحر کار مغنّیوں کا جادو چلنے لگا۔ اربابِ نشاط ملک کے کونے کونے سے قدردانوں کی محفلیں آراستہ کرنے کے لیے اکٹھے ہونے لگے اور اہل دولت وثروت لطفِ حیات کشید کرنے کے نئے نئے بہانے ڈھونڈنے لگے۔ امراء میں سے بعض حسین چہروں اور نرم وگداز جسموں کے دل دادہ تھے، بعض خواجہ سراؤں کی قربت میں خوش ہوتے تھے جب کہ بعض شوقین مزاج نوخیز لڑکوں کے لچکیلے بدنوں پر جان دیتے تھے۔ محمد شاہی دور میں خاص طور پر امرد پرستی کے رجحان کو فروغ ہوا۔ اس دور کے امرائے عظام میں مرزا منّو اور اعظم خاں امرد پرستی کے حوالے سے خاص شہرت رکھتے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس زمانے میں اغلام بازی نے فن کا درجہ حاصل کرلیا تھا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق:

> ''اس دور میں فنِ امرد پرستی نے اتنی ترقی کی کہ نہ صرف استادی شاگردی کے رشتے قائم ہوگئے بلکہ لڑکوں کی سجاوٹ، وضع قطع، آرائش اور حسن وجمال کے طور طریقے بھی مقرر ہوگئے۔''(۵)

اُردو شاعری بھی اس کجروی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔ میرؔ، سوداؔ اور ناسخؔ کی شاعری میں یہ مضمون بکثرت ملتا ہے۔ شاہ مبارک آبرو نے تو پوری مثنوی 'در موعظۂ آرائشِ معشوق' کے عنوان سے تخلیق کی جس میں امردوں کو وہ طریقے بتائے گئے ہیں جن سے وہ عشاق کا دل لبھاسکیں۔ نواب درگاہ قلی خاں نے 'مرقّع دہلی' میں محمد شاہی دور کے معروف امردوں کی تفصیل بیان کی۔ ان خوش جمال لڑکوں میں رئیس المخنثین تقی، اللہ بندی، رجی

امرد، میاں ہنگا، سلطانہ، درگاہی، سرس روپ، خوش حالی اور چک مک قابلِ ذکر ہیں۔ چک مک کے بارے میں نواب صاحب لکھتے ہیں:

''چک مک کی بہارِ جوانی میں شوخی کا عجب رنگ تھا۔ جمہور کے دلوں کو اس نے موہ لیا تھا۔ بادشاہ جم جاہ بھی اس کے فریفتہ تھے۔ چک مک اسے خطاب دیا ہوا تھا......لوگ بڑی رقمیں خرچ کرتے تھے جب کہیں جا کر اس کے ساتھ شب بسری ممکن ہوتی تھی اور زر، راہوں میں بچھانے سے مدعا کھل پاتا تھا......اس سے آشنائی کا رابطہ بڑی پہنچنے والی ساجتوں کے بغیر نامکمل۔''(۶)

جب 'بادشاہ جم جاہ' کے مشاغل کی یہ صورت تھی تو عوام کیوں کر 'دینِ ملوک' سے الگ رہتے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے سلطان اور رعایا کے مابین تعلق کو جسم و روح کی تشبیہہ سے واضح کیا ہے۔ آپ نے اپنے ایک مکتوب میں فرمایا ہے:

''بادشاہ روح کی مانند ہے اور تمام انسان جسد یعنی جسم کی طرح۔ اگر روح درست ہے تو بدن بھی درست ہے اور اگر روح بگڑ جائے تو بدن بھی بگڑ جاتا ہے۔''(۷)

چنانچہ حکمرانوں کی روش کو دیکھ کر عوام بھی راہِ راست سے دور ہو گئے اور مجموعی طور پر پورا معاشرہ بے راہ روی کا شکار ہو گیا۔ اگر محمد شاہ، بیدار مغز حکمران ہوتا تو اس دورِ امن و فراغت میں انتظامِ مملکت کی بحالی کی طرف توجہ دیتا اور عسکری طاقت کو مستحکم کرتا لیکن اس کے اعصاب پر تو اربابِ نشاط نے مکمل طور پر غلبہ پا لیا تھا اور یوں محمد شاہ کی دہلی محض ایک عیش گاہ بن کر رہ گئی تھی۔ شاہ حاتم جو خود مجلسی مزاج کے زندہ دل انسان تھے، ان کی بہاریہ مثنوی مسمّی بہ 'بزمِ عشرت' اسی زمانے کی تخلیق ہے (۱۱۴۷ھ)۔ اس مثنوی میں شہر دہلی کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے اس کی پرلطف صحبتوں، باغات کی رنگینیوں، نغمہ و آہنگ کی محفلوں، سبزہ رُو اور شوخ و چنچل محبوبوں اور خمار زدہ رومانی فضاؤں کا پُر لطف بیان ملتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

نہیں ہے شہر، دہلی ہے گلستاں — چمن سے جس کا خوش تر ہے بیاباں
جدھر دیکھو تدھر ہر کوچہ و بازار — ہوا ہے گل رُخاں سے صحنِ گل زار
ہر اِک دوکاں پہ چشمک باز و عیار — کہ جن کی ہر نگہ پر سو خریدار
ہر اِک جا سبزہ رنگ و سروِ دل جُو — ہر اِک نازک میانِ عنبریں مو
ہر اِک ناز و ادا میں فتنۂ دہر — ہر اِک کا غمزۂ خوں ریز ہے قہر
ہر اِک گہہ کافر و گاہے مسلماں — ہر اِک عاشق کے حق میں ہے فتنۂ جاں

سوادِ ہند کا جس کو مزا ہے   وہ لذّت سے جہاں کی آشنا ہے
گلوں کے کان میں کہتی ہے بلبل   یہی کشمیر ہے اور یہی کابل
وہ بے شک وقت کا شاہِ جہاں ہے   جو کوئی متوطنِ ہندوستان ہے (۸)

ان اشعار سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ نادر شاہی حملے سے قبل کے دورِ امن میں دہلی کی نشاطیہ تہذیب اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گئی تھی۔ اس دور کی شاعری میں مجموعی طور پر یہ نشاطیہ آہنگ بڑا نمایاں ہے۔ اسی مثنوی میں 'وصفِ بادشاہ' کے عنوان سے گیارہ اشعار درج ہیں جن میں محمد شاہ کو شجاعِ دہر، شاہِ ہفت کشور اور شاہِ بحر و بر کے القابات سے مخاطب کیا گیا ہے جب کہ خاقان و قیصر کو اس کا ثنا خواں بتایا گیا ہے۔ یہ مضامین اگر چہ روایتی نوعیت کے ہیں تاہم اس زمانے کا خارجی منظر نامہ اتنا دل کش تھا کہ اس کے باطن میں چھپی تلخ حقیقت سے نظریں ملانا ممکن نہیں رہا تھا تاہم پسِ پردہ کہیں یہ احساس ضرور موجود ہے:

ہوا جب بزم میں آواز بیں کا
گیا غم دل سے سب دنیا و دیں کا

گویا یہ وہ زمانہ تھا جب اہلِ دہلی دانستہ طور پر عیش و نشاط کی آڑ میں دنیا و دیں کا غم غلط کر رہے تھے۔ اسی مثنوی کے حصہ 'وصفِ بزمِ نغمہ و آہنگ' میں اس وقت کے مروّجہ راگوں اور ہر طرح کے موسیقی نوازوں کا ذکر آیا ہے جن سے اُس وقت کی دہلی پُر رونق تھی۔ حاتم کی ایک اور مثنوی 'وصفِ سراپا' (۱۱۴۶ھ) بھی اسی نشاطیہ دور کی یادگار ہے جس میں عنوانات کے تحت محبوب کا پورا سراپا بیان کیا گیا ہے۔(۹) مرزا مظہر جانِ جاناں جیسے درویش بزرگ بھی اِس دور کی رنگین فضا سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اُن کی غزل کا یہ مطلع شاید اسی دور کی یادگار ہے:

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار
ہائے کچھ چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار

ڈاکٹر جمیل جالبی اس دورِ نشاط پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''کوئی منزل، کوئی جہت اور مقصد چوں کہ اس معاشرے کے سامنے نہیں تھا اس لیے اس کا ہر عمل اور ہر فعل فکر و خیال سے عاری تھا۔ سارا زور موسیقی، راگ رنگ، رقص و سرور، ناٹک، داستان، سوانگ اور شراب و دلآرام پر تھا۔''(۱۰)

یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ عیش و سرمستی میں مبتلا یہ معاشرہ اگر چہ گہرے غور و تعمق کی صلاحیت کھو چکا تھا، تاہم احساسِ گناہ سے مکمل طور پر عاری نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا قلب و ضمیر کا بھاری بوجھ اُتار پھینکنے کے لیے اسے کسی

فکری سہارے کی ضرورت تھی اور مذہب وتصوف کی صورت میں اس نے یہ سہارا تلاش کرلیا تھا۔ بہ ظاہر یہ عجیب تضاد ہے تاہم خیر وشر کی خصوصیات فطرتِ انسانی میں داخل ہیں۔ وہ نہ مکمل فرشتہ بن سکتا ہے، نہ مجسم شیطان۔ اسے انسان رہنے کے لیے دل کے کچھ حصے کو ضرور صاف رکھنا پڑتا ہے اور یہی صورتِ حال اس معاشرے کی بھی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس دور میں مذہب وتصوّف بھی اپنی حقیقی روح سے عاری محض ذہنی تعیش بن کر رہ گیا تھا۔ مذہب سے عملیت جاتی رہی تھی اور محض رسوم کا ڈھیر رہ گیا تھا جب کہ عام لوگوں کا تصورِ روحانیت محض مزار پرستی اور ظاہر داری تک محدود ہو گیا تھا۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے تضاد سے بھرپور اس معاشرت کا چہرہ اس طرح دکھایا ہے:

> ''لوگ بڑی عقیدت اور ارادت کے ساتھ خانقاہوں اور مزارات پر حاضر ہوتے تھے پھر اسی جوش اور ولولے سے طوائفوں کی محفلوں میں شرکت کرتے تھے۔ ان کی رندی اور مذہبیت ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ نہ رندی مذہب پر غالب آتی نہ مذہب رندی پر۔''(۱۱)

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

> ''یہ مذہبیت جو رندی کے پہلو بہ پہلو چلتی تھی، فسق وفجور سے زیادہ متفق تھی۔ یہ ضمیر کی آواز کچلنے کا ایک ظالمانہ انداز تھا۔''(۱۲)

زندگی کے اِسی تضاد نے اس دور کی شاعری میں ایہام گوئی کو فروغ دیا جس میں ذومعنویت یا بات کی دو سطحوں کو کاری گری سے پیش کیا جاتا تھا۔ رندی اور پارسائی کی اس دوآتشہ آگ کے سامنے شمشیر وسناں کی آب وتاب بالکل ماند پڑ گئی اور نتیجتاً فوج کمزور سے کمزور ہوتی چلی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ جب نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا تو مغل فوج اپنی آرام طلبی اور مسلسل بے کاری کی وجہ سے تر نوالہ ثابت ہوئی۔ اس حملے کے نتیجے میں سو کے قریب بڑے امیر اور بیس ہزار مغل فوجی قتل ہوئے۔(۱۳) جو مغلوں کی عسکری طاقت کے لیے زبردست دھچکا تھا۔ محمد شاہ کی شاہ خرچیوں اور نادر شاہ کی لوٹ مار کی وجہ سے شاہی خزانے میں اتنی سکت نہ رہی کہ نئی فوج بھرتی کر کے اس کی پرورش کی جاسکتی، نتیجتاً مغل حکومت اور رہی سہی فوج کے درمیان تنخواہوں کے مطالبے پر مستقل تنازع رہنے لگا۔ محمد شاہ پر سپاہیوں کی نو، نو ماہ کی تنخواہیں واجب الادا ہو گئیں اور حالات اس حد تک خراب ہو گئے کہ مغل امیرِ عظام اور اُردو وفارسی کے معروف شاعر نواب عمدۃ الملک امیر خاں انجام (م: ۲۷ دسمبر ۱۷۴۶ء) پر اس کے نوکروں کی چودہ ماہ کی تنخواہیں چڑھ گئیں۔ انہی نوکروں میں سے کسی ایک نے دیوانِ خاص کے قریب انجام کی پیٹھ میں ایسی کٹاری ماری کہ وہیں جان نکل گئی۔(۱۴) ستم بالائے ستم کہ نوکروں نے مرحوم کے اموال اور لاش پر قبضہ کرلیا۔ چار دن بعد جب تنخواہیں ادا ہوئیں تو انجام کی تدفین ممکن ہوئی۔(۱۵) شاکر ناجی کے اس شعر میں اسی افسوس ناک واقعہ کا بیان ہوا ہے:

کیوں شہیدِ عشق کے تابوت پر کرتے ہو جنگ
لے چلے ہو دھوم میں یارو یہ سوڑا ہے مگر

محمد شاہ کے بعد شاہی خزانے کے حالات مزید دگرگوں ہو گئے اور انتظامی ڈھانچے کی کفالت ناممکن ہو کر رہ گئی۔ ڈاکٹر نعیم احمد کے مطابق:

> ''احمد شاہ کے عہدِ سلطنت میں فوج اور شاہی عملے کی غیر ادا شدہ تنخواہ بہت زیادہ ہو گئی اس کے پہلے سنہِ جلوس سے لے کر ساتویں برس تک بھوکے ننگے فوجیوں اور دوسرے ملازموں کی اپنے واجبات کے لیے جدوجہد ایک طویل داستان ہے۔''(۱۶)

احمد شاہ کے دور میں تو صورتِ حال اِس حد تک بگڑی کہ بادشاہ کی عزت پر بن آئی۔ جلوس کے چھٹے برس جب وہ نمازِ جمعہ کے لیے روانہ ہونے لگا تو بندوقچیوں نے جن کی پندرہ ماہ کی تنخواہیں واجب الادا تھیں، توپیں نکالنے سے صاف انکار کر دیا۔ انہوں نے لال قلعہ کا محاصرہ کر لیا اور زنانہ محل میں کھانے پینے کی ترسیل تک روک دی۔ ڈاکٹر نعیم احمد نے 'مراۃ الصفات' کے حوالے سے لکھا ہے:

> ''ایک بار تال کٹورہ جانے کے لیے احمد شاہ نے پیش خانہ وہاں پہنچانے کا حکم دیا۔ خانساماں نے کہا پیسہ لیے بغیر بار بردار کام کرنے کو تیار نہیں اور فیل خانے کے داروغہ نے بتایا کہ ہاتھی چار، چار وقت کا فاقہ ہونے کی وجہ سے بوجھ نہیں اُٹھا سکتے۔''(۱۷)

احمد شاہ کے جانشین عالم گیر ثانی کے دور میں صورتِ حال مزید ابتر ہو گئی۔ سلطنت کے مختارِ کل کی عماد الملک کی ذاتی فوج کے علاوہ شاہی ملازمین کی تین تین سالوں کی تنخواہیں چڑھ گئیں۔ تنخواہ دار طبقہ بھاری سود پر ساہو کاروں سے قرض اُٹھانے پر مجبور ہو گیا اور اس کے عوض گھر کی اشیاء گروی رکھنے کا کلچر عام ہو گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ سپاہی اپنے جنگی ہتھیار تک بیچنے پر مجبور ہو گئے۔ اسی لیے ان کا احتجاج اکثر حدِ اعتدال سے بڑھ جاتا تھا۔ سودا کے 'قصیدہ شہر آشوب' میں اس ساری صورتِ حال کی تصویر کشی کچھ اس طرح ہوئی ہے:

گھوڑا لے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی	تنخواہ کا پھر عالمِ بالا پہ نشاں ہے
گزرے ہے سدا یوں علف و دانے کی خاطر	شمشیر جو گھر میں تو سپر بنیے کے یاں ہے
ثابت ہے جو دگلا تو نہیں موزوں میں کچھ حال	تیروں میں ہے پر گیری تو بے چلّہ کماں ہے

اور آخر میں مایوسی قنوطیت کی حدوں کو چھونے لگتی ہے:

دنیا میں تو آسودگی رکھتی ہے فقط نام	عقبٰی میں یہ کہتا ہے کوئی اس کا نشاں ہے
یاں فکرِ معیشت ہے تو واں دغدغۂ حشر	آسودگی حرفیست نہ وہ یاں ہے نہ واں ہے (۱۸)

سلطنت کے مختارِکل عماد الملک نے اس معاشی ابتری کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے بادشاہ کی خالصہ زمینوں (۱۹) تک پر قبضہ کرلیا نتیجتاً شاہی آمدن بند ہو جانے سے مغل شہزادوں کے چولہے تک ٹھنڈے ہوگئے۔

شاہ عالم ثانی کے دور میں نجف خاں (م:۱۶اپریل ۱۷۸۲ء) سلطنت کا مختارِکل بن گیا تھا۔(۲۰) اس نے شاہ عالم ثانی کو پیسے پیسے کا محتاج بنا دیا۔شاہی حرم کی خواتین اس حد تک دل برداشتہ ہوئیں کہ دریائے جمنا میں خودکشی کا ارادہ باندھ لیا۔بادشاہ خود اپنی پریشان حالی اور معاشی محتاجی کی وجہ سے موت کی دُعائیں کرتا تھا۔(۲۱) بعد میں جب مرہٹوں کا عروج آیا اور شاہ عالم ثانی کا 'فرزندِ دل بند'(۲۲) مادھوراؤ سندھیا مختار السلطنت مقرر ہوا تو اس کی تنگ دستی مزید بڑھ گئی۔اسی حالتِ لاچارگی میں شاہ عالم نے سندھیا کو مخاطب کرکے یہ شعر پڑھا جس سے اس کی شدید بے بسی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے:

ملک مال سب کھوئے کر، پڑے تمہارے بس
مادھو ایسی کیجیو ، آوے تم کو جَس

ستم تو یہ تھا کہ بادشاہ کی مفلسی کی خبر عام تھی۔عوام شاہ عالم کی خستہ حالی کو ضرب المثل کے طور پر بیان کرنے لگے تھے۔میر تقی میر کی مثنوی 'ننگ نامہ' میں سرائے خانے کی بھٹیارن نے کھانے کا پوچھا تو میر نے بتایا کہ 'صاحب' کی طرف سے آئے گا۔اس پر بھٹیارن کا کرارہ جواب دیکھنے کے لائق ہے:

ہم تو جانا تھا آدمی ہو بڑے — چار پانچ آدمی ہیں پاس کھڑے
سو تو نکلے ہو کورے بالم تم — ہوا گدا جیسے شاہِ عالم تم

یہی وہ خاص حالات تھے جن میں شاہ عالم ثانی نے انگریزوں کا پنشن خوار بننا قبول کرلیا کہ اس سے کم از کم اس کے باورچی خانے کا نظام تو چلتا تھا۔

جب بادشاہوں کی معاشی تنگ دستی کی یہ صورت تھی تو عامۃ الناس کا کیا حال ہوتا اس لیے کہ صنعت و حرفت اور ہنرمندی کی قدر اور افزائش بھی بڑی حد تک امراء وسلاطین کے مرہونِ منت ہی ہوتی ہے۔لہٰذا مجموعی طور پر اقتصادی زوال نے شدت پکڑ لی اور نوبت یہاں تک آئی کہ سیّد غلام علی خاں کے مطابق:''دہلی کے بہت سے نامور شرفا اور امراء کی اولاد در بدر ہوکر لکھنؤ اور دوسرے علاقہ جات میں دریوزہ گری یا کسبِ رذیل کرنے پر مجبور ہوگئی۔''(۲۳)

اٹھارویں صدی عیسوی کی شاعری اپنے عہد کی معاشی تباہ حالی کی چشم دید گواہ اور بنیادی ماخذ ہے۔میر، سودا، مصحفی، انشا اور سب سے بڑھ کر نظیر نے اس اہم ترین سماجی المیے کو موضوعِ شاعری بنایا ہے۔اس دور کی شاعری

میں حد سے بڑھی بے روزگاری، معاشی وسائل کی کم یابی، تنخواہوں کی عدم دست یابی اور صنعت وحرفت کی بربادی جیسے موضوعات تقریباً ہر شاعر کے ہاں دیکھے جاسکتے ہیں۔ میر وسودا نے اپنے شہر آشوبوں اور ہجویہ قصائد میں اس معاشی خلفشار کو پیش کیا ہے تو مصحفی وانشا[۲۴] اور دوسرے شعراء نے بھی جہاں تہاں حالات کا رونا رویا ہے۔ نظیر نے خاص طور پر اپنی نظموں میں مفلسی اور اُس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی نفسیات کی تصویر کشی کی ہے۔ اُسے اپنے عہد میں مفلسی سے بڑی تلخ سچائی نظر نہیں آتی جو اُن کے نزدیک تند وتیز سیلاب کی طرح یورش کر کے معاشرے کی ہر اچھی تہذیبی قدر کو بہا کر لے گئی:

ہر گھر میں اس طرح سے پھر آئی ہے مفلسی
پانی کا ٹوٹ جائے ہے جوں ایک بار بند

نظیر، تمام معاشرتی طبقات کو مفلسی کے پنجۂ خونی میں تڑپتا اور کراہتا ہوا محسوس کرتا ہے اور بلاتفریق و تخصیص سب کے احوالِ واقعی قلم بند کرتا جاتا ہے، حتیٰ کہ وہ طوائف کے فلاکت زدہ دلِ حزیں اور غربت کے ہاتھوں پھٹے پرانے دوپٹے اور بناؤ سنگھار سے محروم چہرے کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ سب سے دل چسپ بات یہ ہے کہ نظیر کے ہاں اخلاقی اور صوفیانہ تصورات بھی اس کے معاشی نظریات کے تناظر میں ہی کھلتے ہیں۔

سعادت یار خاں رنگین نے بھی اپنے ''شہر آشوب'' میں حالات کے سنگین مدوجزر پر تبصرہ کیا ہے۔ وہ آخر میں دین داری اور پیر پرستی کو تمام عوارض کے حل کے طور پر پیش کرتے ہیں:

دل سے تو کلمے کو پڑھ جا — کشتی میں ایمان کی چڑھ جا
پیر ہے اس کشتی کا مانجھی — بن جا اپنے پیر کا ساجھی

اس تہذیب کا بنیادی المیہ ہی یہی تھا کہ مخصوص حالات وعوامل کی وجہ سے لوگوں کے قوائے عملی سرد پڑ گئے تھے اور سعی وعمل سے گریز اور مقاصد آفرینی کے فقدان نے انہیں حقائق سے چشم پوشی کرنے کی ادا سکھا دی تھی، نتیجتاً تقدیر پرستی اس تہذیب کے باطن میں رَچ بس گئی تھی اور وہ کسی آسمانی امداد اور پیر کی نظرِ کرم کے محتاج بن کر رہ گئے تھے۔ تقدیر پرستی اور پیر پرستی کی یہ مجہول صورت بھی اُردو شاعری میں دیکھی جاسکتی ہے۔

اٹھارویں صدی عیسوی کے روبہ زوال معاشرے کا ایک پریشان کن سماجی حوالہ یہ بھی ہے کہ اس زمانے میں ذاتی قابلیت وکردار کی بجائے معاشی ذرائع کی بنیاد پر ایک خاص طرح کا طبقاتی نظام وجود میں آ گیا تھا، جو اسلامی تعلیمات کے بنیادی اصولوں: مساوات، برابری اور اسلامی اخوت سے یکسر متصادم تھا۔ اس سماجی نظام میں سرکاری اہل کاروں، فوجی عہدے داروں اور بڑے تاجروں کو طبقۂ اشرافیہ میں شمار کیا جاتا تھا اور جتنے پیشہ ور تھے

انہیں پست درجے میں گنا جاتا تھا۔ محنت مشقت کو معیارِ شرافت کے منافی سمجھا جانے لگا تھا اور دست کاروں اور ہنر مندوں کو فی الاصل شودر اور کمی کمین تصور کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہر شخص حکومتی عہد اور منصب و خطاب پانے کی دوڑ میں لگا ہوا تھا، اور یوں غیر پیداواری طبقہ ملکی معیشت پر بوجھ بننے کے ساتھ طبقاتی استحصال میں بھی آگے آگے تھا۔ ڈاکٹر مبارک علی اس صورتِ حال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مغل معاشرہ میں رعیت کی کوئی حیثیت نہیں تھی اور نہ ہی بادشاہ اور امراء کے مقابلے میں انہیں کسی قسم کے حقوق حاصل تھے۔ رعیت کا اکثریتی حصہ بے حس، بے جان اور مظلوموں کا ایک ایسا طبقہ تھا جو ہر قسم کے شعور سے عاری تھا۔ اس لیے یہ طبقہ محض محنت مزدوری کر کے حکمران طبقوں کو دولت فراہم کرتا تھا۔''(۲۵)

اس پیچیدہ طبقاتی نظام نے نہ صرف اسلامی مساوات کے تصور پر زد لگائی، بلکہ معاشرے میں غیر معمولی رکھ رکھاؤ، حفظِ مراتب، وضع داری اور پُر تکلف طرزِ زیست کو بھی بڑھاوا دیا۔ طبقۂ اشرافیہ کے ہاں تکلّفاتِ زندگی کی یہ صورت بن گئی تھی کہ رسمِ دنیا نبھاتے نبھاتے دم ٹوٹنے لگتا، ظاہری نک سِک درست رکھنے کے لیے قرض کی مے پینا عام دستور ہو گیا۔ وضع بدلنا ناقابلِ معافی جرم ٹھہرا اور فضول خرچی اور نمود و نمائش جیسے غیر صحت مندانہ عوامل معیارِ شرافت و برتری بن گئے۔

فضول خرچی کے اس مرض میں مسلم اشرافیہ کے ساتھ ساتھ ہندو امراء بھی مبتلا تھے۔ اس حوالے سے راجہ جُگل کشور (م:۱۱۶۹ھ) کی روداد بڑی عبرت آموز ہے۔ راجہ صاحب نے اپنے بڑے لڑکے کنور آنند کشور کی شادی اتنی دھوم دھام سے کی کہ دہلی کے ہر خاص و عام کو مدعو کیا۔ ایک طرف ''صلائے عام'' کی یہ صورت تھی، دوسری طرف کچھ عرصہ بعد جب میر تقی میر نے اُس سے روزگار کی شکایت کی تو وہ شرم سے پیلا پڑ گیا، کہنے لگا: ''میں خود مفلس ہوں اگر کچھ ہوتا تو ہرگز دریغ نہ کرتا۔''(۲۶)

اس طبقاتی معاشرے میں شادی بیاہ کی بھی عجیب صورت بن گئی تھی۔ مسلمانوں میں سیّد، مغل، شیخ اور افغان اونچی ذاتوں میں شمار ہوتے تھے تاہم یہ طبقات عموماً باہمی رشتہ داری سے احتراز برتتے تھے۔ ستم تو یہ تھا کہ ایک حسب نسب کا خیال رکھنے والا سیّد، پیشہ ور سیّد سے رشتے ناطے کا روادار نہیں تھا، اس لیے کہ اس معاشرے میں ذات برادری کا تعین پیشوں کی مناسبت سے ہونے لگا تھا۔ اگر کوئی مغل معاشی حالات سے مجبور ہو کر سقائی کا پیشہ اختیار کر لیتا تو مغل طبقہ اس سے تعلق ختم کر کے رشتہ داری حرام کر لیتا۔ سیّد کی سیادت کتنی ہی مستند ہوتی اگر وہ نان بائی کا پیشہ اختیار کر لیتا تو اس کی سیادت کا وقار ختم ہو جاتا۔ یہی حال افغان اور شیخ برادریوں کا بھی تھا۔(۲۷) میر کے اس

شعر کو اس مخصوص طبقاتی نظام کے تناظر میں بھی دیکھا جائے تو مضائقہ نہیں:

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

اس طبقاتی معاشرے میں فطری طور پر مسترد شدہ، دھتکارے ہوئے اور ادنیٰ طبقات کی توجہ صوفیانہ تعلیمات کی طرف مرکوز ہوئی، جن میں کسی امتیاز کے بغیر احترامِ انسانیت کا درس دیا جا رہا تھا۔ صوفیا نے ظاہری تفریقات کو نظر انداز کرتے ہوئے وحدتِ انسانیت کی بات کی اور مختلف طبقات کو ملانے کے لیے پُل کا کردار ادا کیا۔ یہاں یہ دلچسپ حقیقت بھی پیشِ نظر رہے کہ صوفیا نے مقتدر طبقوں کی بجائے ہمیشہ عام لوگوں کو گلے لگایا اور صوفی شعراء نے خاص طور پر اپنی شاعری میں عام لوگوں کی ذہنی ضرورت کو پیشِ نظر رکھا اور روزمرہ کی زندگی سے شعری منظر نامہ مرتب کیا۔ اس کی اہم ترین مثال صوفیانہ شاعری میں ''چرخے'' کی علامت ہے جسے اگرچہ روحانی مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا ہے، تاہم لاشعوری طور پر جولاہے کی محنت و مشقت کو عظیم سماجی خدمت کے طور پر بھی تسلیم کیا گیا ہے۔ صوفیا کی یہی 'عوام دوستی' اس عہدِ تاریک کا روشن حوالہ ہے۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ اسپنگلر، آسوالڈ، زوالِ مغرب (جلد: اوّل، دوم)، مترجم: ڈاکٹر مظفر حسن ملک، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۸ء، دیکھیے: جلد اوّل: ص ۲۷، ۲۸، ۴۹، ۵۰، ۵۲، ۱۲۵، ۱۲۵تا۱۲۹/ جلد دوم: ص ۵۹، ۴۹۹، ۵۰۰
اسپنگلر کے فلسفۂ تہذیب کے لیے مزید دیکھیے: اقبال، تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، مترجم: سیّد نذیر نیازی، لاہور: بزمِ اقبال، ۱۹۹۴ء، ص ۲۱۸، ۲۱۹

۲۔ نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر، دِلّی کا دبستانِ شاعری، لاہور: عشرت پبلشنگ ہاؤس، س ن، ص ۱۷

۳۔ اشتیاق حسین قریشی، ڈاکٹر، برعظیم پاک وہند کی ملتِ اسلامیہ، کراچی: کراچی یونیورسٹی، ۱۹۶۷ء، ص ۲۲۲

۴۔ اسلم انصاری، ڈاکٹر، اُردو شاعری میں المیہ تصورات، لاہور: مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، مارچ ۲۰۰۸ء، ص ۶۴

۵۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخِ ادبِ اُردو (جلد دوم، طبع پنجم)، لاہور: مجلس ترقیٔ ادب، ۲۰۰۵ء، ص ۱۹۸

۶۔ درگاہ قلی خاں، نواب، مرقعِ دہلی، مترجم: ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید یزدانی، لاہور: ایلفا براوو، ۱۹۸۸ء، ص ۹۳، ۹۴

۷۔ مجدد الف ثانی، مکتوباتِ امام ربانی (حصہ دوم)، مکتوب نمبر ۶۷، مترجم: قاضی عالم الدین نقشبندی مجددی، لاہور: اسلامی کتب خانہ، س ن، ص ۲۳۸

۸۔ حاتم، شیخ ظہور الدین، دیوان زادہ، مرتب: ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، لاہور: مجلسِ ترقیٔ ادب، دسمبر ۲۰۰۹ء، ص ۲۵۹

۹۔ ایضاً، ملاحظہ کیجیے: ص ۲۴۶ تا ۲۴۹

۱۰۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخِ ادبِ اُردو (جلد دوم)، ص ۱۹۹

۱۱۔ خلیق احمد نظامی، تاریخِ مشائخِ چشت، لاہور: مشتاق بک کارنر، س ن، ص ۳۴۴

۱۲۔ ایضاً، ص ۳۴۵

۱۳۔ نعیم احمد، ڈاکٹر، شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ، علی گڑھ: ادبی اکادمی، ۱۹۷۹ء، ص ۵۸

۱۴۔ لطف، میرزا علی، تذکرۂ گلشنِ ہند، لکھنؤ: اُتر پردیش اُردو اکادمی، ۱۹۸۶ء، ص ۱۶

۱۵۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخِ ادبِ اُردو (جلد دوم)، ص ۱۳۸

۱۶۔ نعیم احمد، ڈاکٹر، شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ، ص ۶۲

۱۷۔ ایضاً، ص ۶۵

۱۸۔ سودا، مرزا رفیع الدین، کلیاتِ سودا (جلد دوم)، ص ۳۴۵-۳۵۹

۱۹۔ خالصہ زمینیں وہ تھیں جو خاص بادشاہ کی ملکیت ہوتی تھیں اور ان سے محلاتِ شاہی کے اخراجات کا بندوبست کیا جاتا تھا۔

۲۰۔ نجف خاں، عیش پسندی میں اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ میر کے لفظوں میں ''مکروہات کے استعمال اور عورتوں کی تماش بینی میں اتنا منہمک ہوا کہ بدن سے طاقت زائل ہوگئی:

'ذکرِ میر'، ص ۳۲۱

۲۱۔ نعیم احمد، ڈاکٹر، شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ، ص ۷۵

۲۲۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے مطابق:

> ''مادھو راؤ سندھیا کو مہابلی نے فرزندِ دل بند، وکیلِ مطلق، مدارالمہام، عالی جاہ، مادھو راؤ جی سندھیا بہادر کے القاب وخطابات سے نوازا تھا۔ کم وبیش سارا ملک ہند اور نظام الملک اور ٹیپو سلطان کے علاقوں کو چھوڑ کر نصف سے زیادہ ملک ہند اس کے زیرِ نگیں تھا۔''
>
> چاند تھے سرِ آسماں، کراچی: شہرزاد، جنوری ۲۰۰۶ء، ص ۹۴

۲۳۔ غلام علی خاں، سیّد، عمادت السعادت، لکھنؤ مطبع نول کشور، ۱۹۸۷ء، ص ۶۵

۲۴۔ معاشی وسائل کا فقدان اور بے روزگاری اس دور کی شاعری کے مستقل مضامین ہیں۔ خاص طور پر اشرافیہ کے حالات بڑے تنگ پڑ گئے تھے کیوں کہ وہ اپنی وضع داری کی وجہ سے معمولی پیشوں اور محنت ومشقت سے بھاگتے تھے۔ انشا نے اشرافیہ کی اس بے کاری کو بڑی عمدگی سے اس شعر میں نظم کیا ہے:

نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو
جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بے کار بیٹھے ہیں

۲۵۔ مبارک علی، ڈاکٹر، مغل دربار، لاہور: نگارشات، ۱۹۸۶ء، ص ۱۳۶، ۱۳۷

۲۶۔ میر، تقی میر، ذکرِ میر، ترتیب وترجمہ: ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، لاہور: مجلس ترقیٔ ادب، جون ۱۹۹۶ء، ص ۲۵۰

۲۷۔ قتیل، مرزا محمد حسین، ہفت تماشا، لکھنؤ: مطبع نول کشور، ۱۸۷۵ء، ص ۱۱۷

❁❁❁